OPEN ACCESS: "*EPISTEMOLOGY*"
eISSN: 2663-5828; pISSN: 2519-6480
Vol.12 Issue 13 June 2023

نبی کریم ﷺ کا انداز خطاب اور روزمرہ مواصلات میں اس کی اہمیت

THE COMMUNICATION STYLE OF THE HOLY PROPHET (S.A.W.W.) AND ITS SIGNIFICANCE IN COMMUNICATION SKILLS

Dr. Amber Ghani
Assistant Professor, Bahria University Karachi Campus

Abdul Raheem
MS Scholar, Bahria University Karachi Campus

Abstract: Muslims have faith in the holy prophet s.a.w.w., which motivates them to carry out his commands. The holy prophet s.a.w.w. Is our role model. His actions must be emulated, whether on an individual or societal level. His ability to communicate at all levels is an important aspect of his personality. He communicated with hundreds of people as a husband, father, brother, friend, messenger, and leader, yet his style has a particular and significant trademark to be followed. Using qualitative research methodology, content was extracted from basic islamic sources such as the holy quran and hadith books, as well as biographies of the holy prophet s.a.w.w. It is stated that the holy prophet s.a.w.w. Communicated very softly with strong arguments when necessary. His tone was both firm and content. He knows how to appropriately set his tone and words at each point, such as when preaching or warning. Finally, the holy prophet s.a.w.w communication's style demonstrates the best communication skills. It provides us with a standard against which to judge other people's communication styles while also making muslims aware of the importance of communication skills in everyday life.

Key words: Communication skills, speech of holy prophet (s.a.w.w), style of speech

تمہید:

اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے۔[1]

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے ایک مکمل رول ماڈل ہیں، ہمارے نجی معاملات ہوں یا قومی معاملات، دینی امور ہوں یا دنیاداری، ہر پہلو سے ہمیں سیرت طیبہ سے راہنمائی لینے چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبی بھی تھے اور حکمران بھی، وعظ و تبلیغ بھی آپ کی ذمہ داریوں میں شامل تھی، آپ معلم بھی تھے اور امت کا تزکیہ نفس بھی آپ نے کرنا تھا، ان سبھی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں آپ علیہ السلام کو وقتاً فوقتاً خطبات دینے پڑتے تھے، ان خطبات میں امت کے ہر فرد کے لیے بالعموم اور معاشرے کے جن افراد کو مختلف مواقع پر خطبات دینے کی ضرورت پیش آتی ہے مثلاً: خطبا و علما، واعظین و تبلیغ دین کا کام کرنے والے لوگ، اساتذہ اور انتظامی معاملات سے منسلک افراد ان کے لیے بالخصوص ان خطبات میں مختلف طرح کے نکات اور راہنمائی کے پہلو موجود ہیں، آپ علیہ السلام کے یہ خطبات محدثین اور سیرت نگاروں نے اہتمام سے نقل کیے ہیں۔

اس مقالے میں ہم حدیث، سیرت اور متعلقہ کتب میں منقول خطبات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جائزہ لے کر مختلف پہلوؤں سے خطاب کے نبوی اصول اخذ کریں گے اور خطاب کے وقت اور عام زندگی میں انہیں اپنانے اور ان کی رعایت رکھنے کے اثرات و ثمرات کا جائزہ لیں گے۔ اس مقالے کے پانچ حصے ہیں: 1- تمہید اور تعارف۔ 2- خطاب کا مفہوم اور اہمیت۔ 3- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات کی خصوصیات۔ 4- نتائج تحقیق وسفارشات۔ 5- حواشی اور حوالہ جات

موضوع کا تعارف:

اللہ جل شانہ نے تمام مخلوقات میں نطق کی صلاحیت صرف انسان کو عطا فرمائی ہے، خدا تعالی کی عطا کردہ دیگر بہت سی صلاحیتوں کی طرح انسان نے اس صلاحیت میں بھی خوب ترقی کی، اس ترقی کے نتیجے میں انسان نے گفتگو کے لیے مواقع کے اعتبار سے کچھ مخصوص اصول اور انداز طے کیے جس میں موقع محل، مطلب و مقصد کے مطابق اس صلاحیت کو استعمال کیا جانے لگا تاکہ مقصد برآری بہتر طریقے سے ہو سکے۔ اس صفت نطق کا استعمال مختلف انداز میں ہوتا ہے، روزمرہ بول چال سے لے کر ادبی شہ پاروں کی تخلیق تک سب اسی صفت نطق کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں، ان صورتوں میں ایک اہم صورت خطاب بھی ہے۔

مفہوم خطاب:

لغت کی عام کتب میں بالعموم لفظ کے صرف ظاہری معنی ذکر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، البتہ لغت کے ماہرین اور ائمہ جب کسی لفظ سے بحث کرتے ہیں تو ظاہری معنی بتانے پر اکتفا کرنے کی بجائے اس لفظ کا سیاق وسباق، اس کے استعمال کا موقع محل اور دیگر نکات بھی ذکر کرتے ہیں، لفظ خطاب اور خطبہ کے معنی و مفہوم بیان کرتے ہوئے بھی ماہرین لغات نے اس لفظ پر دقیق انداز میں کلام کیا ہے جس سے خطاب کی اہمیت اور اس کے دور رس اثرات واضح ہوتے ہیں۔

لغوی اعتبار سے خطاب عربی کے لفظ ''خطب'' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب باہم گفتگو کرنا ہے۔[2]

عربی لغت کے امام راغب اصفہانی خطاب کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "الخطب والمخاطبة والتخاطب: المراجعة في الكلام، ومنه الخطبة، والخطبة تختص بالموعظة" یعنی الخطب، المخاطبة اور التخاطب ان تینوں الفاظ کا مطلب باہم گفتگو کرنا اور آرا کا تبادلہ کرنا ہے، خطبۃ اسی لفظ سے ماخوذ ہے، البتہ خطبۃ کا استعمال وعظ کے معنی کے ساتھ خاص ہے۔[3]

زبیدی نے اپنی معروف کتاب لسان العرب میں لفظ خطب اور خطاب پر مفصل بحث کی ہے اور عمومی و خصوصی معانی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''الخطبة اسم الكلام الذي يتكلم به الخطيب'' یعنی خطیب کی گفتگو کو خطبہ کہتے ہیں۔ مزید برآں زبیدی ابو اسحاق کا قول نقل کرتے ہیں کہ خطاب کے آداب میں سے ایک ادب یہ ہے کہ اس کا باقاعدہ ابتدائیہ اور اختتامیہ ہوتا ہے۔[4]

جرجانی خطاب پر مختصر لیکن مفید کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں: خطاب کا مقصد سامعین کو دنیا و آخرت کے حوالے سے مفید باتوں سے آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ ان باتوں پر عمل کر کے دنیوی و اخروی نقصان سے بچ سکیں۔[5]

قاضی عبدالنبی بن عبدالرسول نے دستور العلماء میں خطاب کے حوالے سے اہم نکات ذکر کیے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ (1) خطبہ نثر میں کہا جاتا ہے، نظم یا اشعار کی صورت میں نہیں ہوتا۔ (2) خطبے کے سب نکات اور مقدمات یقینی بھی ہو سکتے ہیں، سب غیر یقینی یعنی ظنی بھی ہو سکتے ہیں اور بعض یقینی اور بعض ظنی ہوں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ (3) خطبے کا مقصد سامعین کو کسی بات کی ترغیب دلانا، کسی اندیشے سے آگاہ کرتے ہوئے خبردار کرنا یا دونوں پہلو یعنی ترغیب اور ترہیب دونوں بھی ہو سکتا ہے۔ (4) خطبے کا آغاز اللہ جل شانہ کی حمد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام سے ہونا چاہیے۔[6]

خطاب کی اہمیت:

خطاب گفتگو اور کلام کی ایک صورت ہے، عمومی انداز کی گفتگو کے برعکس خطاب کی کچھ خاصیات ہیں ان میں سے ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ جس طرح خط میں باقاعدہ ابتدائیہ اور اختتامیہ ہوتا ہے خطاب میں بھی باقاعدہ آغاز اور اختتام ہونا ضروری ہے، ورنہ خطاب کی افادیت اور تاثیر کم ہو جاتی ہے۔ خطاب کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ خطاب ابتداء انسان کے ذہن و قلب میں پنہاں ہوتا ہے یعنی خطاب کرنے والا فرد خطاب شروع کرنے سے پہلے اس کے نکات ذہن میں سوچ لیتا ہے اور پھر سامعین کی موجودگی میں قوت نطق کو استعمال کرتے ہوئے اس کا اظہار کرتا ہے۔

خطاب کی ماہیت اور اس کے مقاصد پر غور و فکر کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ یک طرفہ عمل نہیں، بلکہ اس میں مخاطب کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح خطاب میں صرف بات کہہ دینا اہم نہیں ہوتا، بلکہ یہ بھی اہم ہے کہ کس طرح اس بات کو مخاطب کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جائے تاکہ وہ خطاب بصدا بصحرا ثابت نہ ہو۔ بالخصوص جب کوئی قائد خطاب کر رہا ہو تو اسے ہر ممکن طریقے سے اپنی بات سامعین کے دلوں میں بٹھانا، ان کے خیالات کی دنیا بدلنا، جذبات ابھارنا، مخالفین کا زور توڑنا، ساتھیوں کی اصلاح و تربیت کرنا اور ان میں جوش، عزم اور ولولہ پیدا کرنا، دشمنوں کو دوست، نہ ماننے والوں کو معترف بنانا، مخالفین کی حجت منقطع کرنا اور ان کی اخلاقی طاقت کا استیصال کرنا، غرض اسے وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک دعوت کے علمبردار اور ایک تحریک کے لیڈر کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اللہ نے اپنے پیغمبر پر جو تقریریں نازل فرمائیں ان کا اندازِ خطابت وہی تھا جو ایک دعوت کے مناسب حال ہوتا ہے۔"[7]

اسلامی تاریخ کے قارئین بخوبی جانتے ہیں کہ خاص اور اہم مواقع پر کیے گیے مسلم قائدین کے خطابات مؤرخین اہمیت سے ذکر کرتے ہیں، واقعات نگاروں کی کوشش ہوتی ہے کہ ان خطابات کے الفاظ اور ان کے اثرات بھی ذکر کریں، چنانچہ اسلامی تاریخ کے قاری کو بخوبی اندازہ ہوگا کہ ایک اچھا خطاب اس قدر مؤثر ہوتا ہے کہ نہ صرف سامعین کے خیالات بدل دیتا ہے بلکہ تاریخ کا دھارا بھی بدل سکتا ہے۔ان خطبات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ خطاب کو مفید اور مؤثر بنانے میں مخاطب کی ذہنی سطح کا خیال رکھنا اور ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جنہیں مخاطب سمجھ سکے بہت ضروری ہے۔ یہ اصول انبیائے کرام کے خطابات اور دعوتی مکالموں میں بہت واضح نظر طور پر نظر آتا ہے۔امین احسن اصلاحی خطاب کی اہمیت کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ''خطابت اور تقریر بیان اسلامی زندگی کا ایک خاص شعبہ ہے جس کو حقیقتاً مسلمانوں نے دنیا میں انتہائی سلیقہ کے ساتھ برپا کیا اور وہ انتہائی فصاحت و بلاغت اور سلاست و روانی کے ساتھ اس وقت گویا ہوئے جبکہ دنیا گونگی اور بولنے کا سلیقہ نہ رکھتی تھی وہ خود ہی نہیں بولے بلکہ انہوں نے ہی دنیا کو بلوایا اور گویا کیا۔زباں کھول دی سب کی نطق عرب نے۔''[8]

ایک اچھا خطاب جس میں الفاظ کا چناؤ بہترین ہو، مخاطبین کی ذہنی سطح اور ساخت کو ملحوظ رکھا گیا ہو، آواز کا اتار چڑھاؤ برمحل ہو سامعین کے خیالات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، ایک حدیث شریف میں اسی طرف کچھ ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض بیان جادو کیسی تاثیر رکھتے ہیں۔[9]

مؤلف ''فہم انسانی'' لکھتے ہیں:

> ''فصاحت و زبان آوری کا انتہائی کمال اپنے مخاطب کے دماغ میں فکر اور استدلال کی گنجائش بہت کم چھوڑتا ہے، بلکہ اس کا خطاب چونکہ تمام تر تخیل اور جذبات سے ہوتا ہے اس لئے سامعین کو اس طرح مسحور کر لیتی ہے کہ ان کی ساری عقل و فہم معطل ہو جاتی ہے۔''[10]

ہم جب قرآن حکیم کے اولین مخاطبین یعنی صحابہ کرام کا تذکرہ پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیات سن کر وہ جس طرح سر تسلیم خم کیا کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا قرآن مجید نے ان پر کوئی اثر کر دیا ہو، چنانچہ مشرکین مکہ نے آپ علیہ السلام پر یہی الزام لگایا کہ (نعوذ باللہ) یہ ہمارے لوگوں کو جادو کے زیر اثر قابو کر لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ کوئی جادو نہیں تھا، بلکہ قرآن مجید کا بے مثال اور عظیم اسلوب خطاب تھا جسے سن کر وہ عرب جو کسی کو اپنے جیسا قادر الکلام نہیں سمجھتے تھے بے ساختہ سر جھکا لیتے تھے۔[11]

یہ وہ اسلوب و انداز تھا جس میں اپنے مخاطبین کی نفسیات، ان کی ذہنی ساخت کو مد نظر رکھا گیا تھا، وہ نفسیات یہ تھیں کہ عرب خود کو زبان و بیان کا شہسوار اور ماہر سمجھتے خیال کرتے تھے، ان کے خیال میں ان سے زیادہ کسی کو قادر الکلامی کا ملکہ حاصل نہیں تھا، لیکن جب قرآن مجید نے ان کی فصاحت و بلاغت کو چیلنج کیا جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ جل شانہ کی طرف سے قرآن کے مقابل کلام پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔[12]

لیکن جب وہ باوجود کوشش کے اس جیسا کلام نہ کہہ سکے تو انہیں عاجزی اختیار کرتے ہی بن پڑی۔ اس لئے اہل عرب میں کمال درجہ تبدیلی میں جہاں دیگر اسباب یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن اخلاق وغیرہ کا عمل دخل تھا وہیں ان سے کیے گیے خطابات کی زبان و بیان بھی ایک بڑا سبب تھی۔

قرآن حکیم کے عرب افکار پر غالب آنے کی ایک اور اہم وجہ یہ تھی کہ قرآن حکیم نے عربوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی روحانیت، ان کے اخلاق و عادات، ان کے محاورے کا خیال رکھا، ان سے جو کہا ان کے معاشرے کے معیارات کے مطابق اور ان کی زبان میں کہا، چنانچہ اس رعایت کی تاثیر دنیا نے دیکھی کہ چند ہی برس میں پورا عرب اسلامی پیغام کا دل و جان سے گرویدہ ہو گیا۔

ایسا نہیں کہ تمام عرب میں ادب کا معیار ایک ہی رہا ہو، بلکہ ان کے مختلف قبائل میں جہاں دیگر رسوم و رواج میں فرق تھا وہیں ادبی اور لسانی فرق بھی تھا اور قرآن مجید قریش کی لغت کے مطابق نازل ہوا تھا، جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب جمع قرآن کا حکم دیا اور چار بڑے قراء صحابہ کو یہ ذمہ داری سونپی تو انہیں یہی ہدایت کی کہ اگر کسی لفظ میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اسے قریش کی لغت کے مطابق لکھنا کیونکہ قرآن مجید قریش کی لغت میں نازل ہوا ہے۔[13]

لیکن اس سب اختلاف کے باوجود یہ قرآنی الفاظ ہی کی خوبی ہے کہ اس نے جیسے قریش کو متاثر کیا بعینہ ویسے ہی دیگر قبائل کو بھی متاثر کیا اور عربوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کو بدل دیا۔

اس انداز خطابت کو مسلمانوں نے بھی اپنایا اور عمدہ خطبات دینا اسلامی معاشرے کی ایک اہم سرگرمی بن کے ابھری، جس کی ایک جھلک بنو امیہ کے عہد میں دیکھی جا سکتی ہے، فلپ حطی اس کی منظر کشی کچھ یوں کرتے ہیں:

Public speaking in its several forms was cultivated during Umayad epoch as never before and attained a height unsurpassed in later times. The khatib used it as an instrument of religion in his Friday sermons, the general resorted to it as a means of arousing military enthusiasm among his troops and the provincial governor depend upon it for instilling patriotic feeling in his subects. In age with no special facilities for propaganda, oratory provided an excellent channel for spreading ideas and kindling emotions. The highly ethical orations of 'Ali, with their rhymes and wise sayings, the sermonettes of the ascetic al-Hasan Al Basri delivered in the presence of the Caliph 'Umar ibn-'Abd-al-'Aziz and preserved by the latter's biographer, the military and patriotic speeches of Ziyad ibn- Abih and the fiery al-Hajjaj—all these are among the most valuable literary treasures handed down to us from the early age.[14]

''بنوامیہ کے عہد خلافت میں خطابت کا فن ایسا پروان چڑھا اور اس نے عرب معاشرے کے مختلف گوشوں میں اس طرح اپنے قدم جمائے کہ نہ اس سے پہلے اس کی نظیر ملتی ہے اور نہ ہی بعد کے ادوار اس کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ خطیب نماز جمعہ کے خطبہ میں اسے مذہب کی تبلیغ کے لیے استعمال کرتے، جرنیل اپنے لشکر میں جذبہ جہاد پیدا کرتے اور صوبے کے حاکم رعایا میں حب الوطنی کا جذبہ ابھارنے کے لیے اس کا سہارا لیتے۔ ایسے زمانے میں جب پروپیگنڈے کی خاص سہولتیں میسر نہ تھیں خطابت نے خیالات کی اشاعت اور جذبات انگیزی کی شاندار راہ پیدا کی۔ حضرت علی کے اعلیٰ درجے کے پند آمیز خطبات جن میں اشعار اور اقوالِ دانش ملتے ہیں، درویش صفت حسن بصری کے وعظ جو انہوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے سامنے کہے اور جنہیں مؤخر الذکر کے سوانح نگاروں نے محفوظ کر لیا، نیز زیاد بن ابیہ، حجاج کی عسکری نوعیت اور حبِ وطن سے بھرپور تقریریں۔۔ یہ تمام ایسے وقیع ترین خزانے ہیں جو قرون اولی سے ہم تک پہنچے ہیں۔''

الغرض خطابت کا فن اسلام و قرآن حکیم کی خاص اصطلاح اور موثر ذریعہ رابطہ ہے جسے بعد میں قرون اولی کے مسلمانوں نے بڑی عمدگی سے استعمال کیا، اسی صلاحیت کی بدولت اہل عرب دنیا میں معروف ہوئے، دین اسلام کو لے کر عجم تک پہنچے اور انہیں بھی سلیقہ خطاب سے روشناس کیا۔

نبی کریم ﷺ کے خطاب کی خصوصیات:

اللہ جل شانہ نے اپنے سب انبیاء ورسل کو کوئی نہ کوئی خاصیت عطا فرمائی تھی، مثلا: حضرت نوح علیہ السلام کا گریہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فراست، حضرت موسی علیہ السلام کا جلال، حضرت داؤد علیہ السلام کا حسن تکلم، حضرت عیسی علیہ السلام کی عاجزی معروف ہے، جبکہ اپنے آخری اور محبوب نبی حضرت محمد ﷺ کو اللہ جل شانہ نے فصاحت وبلاغت کی خاص صفت سے نوازا تھا، اس سے خطاب کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بحیثیت خاتم النبیین ورحمۃ للعالمین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یعنی تمام اعمال میں آپ علیہ السلام کی پیروی کرنا ہمارے کے لیے دنیوی واخروی فلاح وسعات کا وسیلہ ہے، آپ کے اعمال شریفہ میں آپ کا انداز خطاب بھی شامل ہے، چنانچہ آپ علیہ السلام کے انداز خطاب میں امت کے لیے بہت سے قابل تقلید نکات ہیں، اسی لئے تکوینی طور پر اللہ جل شانہ نے ایسا انتظام فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کی ہر ہر لمحہ کی گفتگو صحابہ کرام کے واسطے سے ہم تک پہنچی ہے اور علم وحکمت کے اس بے مثال ذخیرے سے استفادہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آپ علیہ السلام کی مبارک گفتگو حکمت سے لبریز ہونے کے ساتھ ساتھ فصاحب وبلاغت میں بھی اپنی مثال آپ ہے، اسی فصاحت وبلاغت کا نتیجہ ہے کہ آپ علیہ السلام کے ارشاد فرمودہ ایک ایک جملے میں موقع ومحل کی انتہائی رعایت نظر آتی ہے، آپ ﷺ نہ صرف خدا کے نبی اور رسول تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آپ سربراہ مملکت بھی تھے، آپ کو ایک عام شہری سے بھی واسطہ پڑتا تھا اور شاہانِ عالم کو دعوت اسلام دینا بھی آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا، اپنوں سے بھی گفتگو رہتی تھی غیروں سے بھی ہم کلام ہونا ہوتا تھا، آپ نے وعظ وتبلیغ، تعلیم وتزکیہ کا کام بھی کرنا تھا اور مملکت کے شہریوں کے درمیان باہمی نزاع کے فیصلے بھی صادر فرمانے تھے، آپ کے سامعین میں جہاں کائنات کے مہذب ترین لوگ شامل تھے وہیں عرب کے صحراؤں کے خانہ بدوش اور بدوی صحابہ کرام بھی آپ کی مجالس میں حاضر رہا کرتے تھے، آپ کبھی کسی کی دل شکنی کا سبب بننے والی بات ارشاد نہیں فرماتے تھے، بلکہ ہر دم دوسروں کی دلجوئی اور خاطر داری میں کوشاں رہتے تھے، چنانچہ ہم سوچ سکتے ہیں کہ ایسی مختلف النوع ذمہ داریوں سے انتہائی خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہونے والی ذات کے خطاب میں کیا کیا جوہر نہ پائے جاتے ہوں گے، آپ کا کلام مبارک سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ علم وحکمت کے گراں مایہ موتیوں سے پُر ہوتا تھا۔

جیسے آپ علیہ السلام کی ذات مبارکہ جامعِ صفات تھی ویسے ہی آپ کے خطابات بھی مختلف خوبیوں کو سموئے ہوئے ہیں۔ آپ نے مندرجہ بالا تمام حیثیتوں میں خطابات کا ایک گنج گراں مایہ امت کے لیے چھوڑا ہے جو بلاشبہ تاقیامت ہر فرد بشر کے لئے مشعل راہ ہے۔ آپ علیہ السلام کے انداز خطاب کے چند اہم پہلو ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں۔

سادہ انداز خطابت:

نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ میں ہمیں ہر اعتبار سے سادگی نظر آتی ہے، جس طرح آپ کا رہن سہن، نشست و برخاست، کھانا پینا، وضع قطع سبھی کچھ سادہ تھا، اسی طرح آپ کا انداز گفتگو بھی نہایت سادہ تھا، جب بھی گفتگو فرماتے سادہ انداز اور سادہ الفاظ استعمال فرماتے اور خطاب میں سادگی کے ساتھ بے ساختگی ہوتی تھی، تصنع بھرے کلمات کا استعمال نہیں فرماتے تھے، دنیوی بادشاہوں اور امراء کا عمومی انداز جو کہ فخر و مباہات پر مشتمل ہوتا ہے، تصنع اور بناوٹ سے بھرپور ہوتا ہے آپ علیہ السلام نے اس انداز کو کبھی پسند نہیں فرمایا۔ تکلفات سے پاک آپ علیہ السلام کے اس انداز کی بناء پر لوگ آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، آج بھی آپ کے خطبات واحادیث کا مطالعہ کیا جائے تو آپ کے سادہ جملے دلوں پر ویسے ہی اثر انداز ہوتے ہیں اور دل میں ویسے ہی محبت کے اثرات پیدا ہوتے ہیں جیسے دور نبوت میں سننے والوں کے محبت واحترام کے جذبات سے ٹھاٹھیں مارنے لگتے تھے۔ ابوالفداء نے آپ کے اس سادہ انداز کو درج ذیل پیرائے میں بیان کیا ہے:

> ''آنحضرت ﷺ نہایت سادہ طریقہ پر خطبہ دیتے تھے، آپؐ جب اپنے حجرے سے نکلتے تھے تو سلاطین کی طرح نہ آپؐ کے ساتھ چاؤش ہوتے تھے، نہ آپ ﷺ خطبا کا لباس پہنتے تھے۔ ہاتھ میں صرف ایک عصا ہوتا تھا اور کبھی کبھی کمان پر ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے۔ ابن ماجہ میں ہے کہ مسجد جب آپؐ خطبہ دیتے تو دستِ مبارک میں عصا ہوتا تھا اور میدان جنگ میں خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوتے تھے تو کمان پر ٹیک لگاتے تھے۔ جمعہ اور عیدین کا خطبہ تو متعین تھا لیکن اس کے علاوہ خطبہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ جب ضرورت پیش آتی، آپ فی البدیہہ خطبہ ارشاد فرمادیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے زمین پر، منبر پر، اونٹ پر جس جگہ جیسا موقع پیش آیا خطبہ دیا ہے، ضرورت کے لحاظ سے اگرچہ آپؐ کو کبھی کبھی طویل خطبہ دینا پڑتا تھا تاہم آپؐ کے خطبے عموماً مختصر ہوتے تھے۔''[15]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ دینے والوں کو اپنا انداز سادہ رکھنا چاہیے، الفاظ میں تصنع اور بناوٹ سے گریز کرنا چاہیے، اسی طرح اگر کبھی خطبہ دینا پڑے اور باقاعدہ منبر، کرسی وغیرہ کا انتظام نہ ہو تو ماتھا شکن آلود کرنے کی بجائے سنت رسول پر عمل کی نیت سے زمین پر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر خطبہ دے دینا چاہیے، اس سادہ انداز اور سادہ الفاظ کا اثر بھی خوب ہو گا۔

مخاطبین کی غم خواری کا جذبہ:

آپ علیہ السلام کے اکثر خطابات میں ایک چیز نمایاں نظر آتی ہے اور وہ ہے مخاطبین کی فکر، غم خواری، ان کی دنیوی صلاح اور اخروی فلاح کا جذبہ، یہ جذبہ آپ علیہ السلام کے سبھی خطبات میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

آپ علیہ نے مرتبہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد کوہ صفا پر قریش کو جمع کر کے سب سے پہلا جو خطبہ دیا اس میں بھی یہ جذبہ صاف نظر آتا ہے، محدثین نے اس کے الفاظ نقل کیے ہیں: فقال: أرأيتم إن حدثتكم أن العدو مصبحكم أو ممسيكم أكنتم تصدقوني؟ قالوا: نعم، قال: فإني نذيد لكم بين يدي عذاب شديد[16]

> ترجمہ: بھلا یہ بتاؤ کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ صبح یا شام میں کسی بھی وقت دشمن تم پر حملہ آور ہونے والا ہے کیا تم میری بات کا یقین کرو گے؟ سب نے کہا: بالکل، ہمیں آپ کی بات کا مکمل یقین ہے، آپ نے فرمایا: پھر میں تمہیں یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر تم نے میری دعوت اسلام کو قبول نہ کیا تو تمہیں سخت عذاب ہو گا۔

اسی طرح جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: وأنذر عشيرتك الأقربين یعنی: اور اے پیغمبر! اپنے قریب ترین خاندان کو خبردار کرو۔[17]

تو نبی کریم ﷺ نے اپنے عزیز و اقارب کو کھانے پر مدعو فرمایا، کھانے سے فارغ ہو کے آپ علیہ السلام نے سب خاندان والوں کو اسلام قبول کرنے اور خدا کو وحدہ لا شریک تسلیم کرنے کی دعوت دی، اس موقع پر آپ ﷺ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

> يا بني عبد المطلب! إني والله ما أعلم شابًّا في العرب جاء قومه بأفضل مما قد جئتكم به، إني قد جئتكم بخير الدنيا والآخرة."[18]

''یعنی اے بنی عبد المطلب! خدا کی قسم میرے علم کے مطابق عربوں میں کوئی شخص اپنے لوگوں کے لیے اس سے بہتر چیز نہیں لایا جو میں تمہارے لیے لایا ہوں، کیونکہ جس چیز کی دعوت میں دے رہا ہوں یہ دنیا اور آخرت کی سب سے بڑی خیر ہے۔

نکیر میں عمومی انداز اختیار کرنا:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ کا معمول تھا کہ جب کسی شخص میں کوئی کوتاہی دیکھتے اور اس حوالے سے اصلاحی خطبہ دیتے تو کسی کا نام لے کر نکیر نہیں فرماتے تھے، بلکہ عمومی انداز میں بات ارشاد فرماتے تھے۔ آپ فرماتے: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس طرح کے کام کرتے ہیں۔[19]

یہ طرز تکلم نہایت مفید اور مؤثر ہے، اس طرح اصلاحی بات کہنے سے دیگر لوگ بھی بچنے لگتے ہیں اور جس شخص میں خامی ہوتی ہے وہ بھی اس نکیر کو اپنے خلاف نہیں لیتا، اگر نام لے کر کہا جائے تو فائدے کی امید کم ہوتی ہے۔

مخاطبین کے لیے دعا کا اہتمام کرنا:

ایک انسان کے بس میں کوشش کرنا ہی ہے اس کوشش کو پار لگانا اور نتیجہ خیز بنانا محض اللہ جل شانہ کو ہی سزاوار ہے، اس لیے کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت کی بارگاہ عالی میں دعا کرنا بھی ضروری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخاطب پوری امت تھی اس لیے آپ علیہ السلام کا معمول تھا کہ آپ ساری امت کی ہدایت، صلاح اور بھلائی کے لیے دعاؤں کا خوب اہتمام فرمایا کرتے تھے، متعدد احادیث میں آپ علیہ السلام کی یہ دعائیں منقول ہیں۔[20]

سادہ انداز خطابت، مخاطبین کی غم خواری، نکیر میں عمومی انداز اختیار کرنا اور دعاؤں کا اہتمام کرنا یہ چار نکات اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ ان سے خطاب میں غیر معمولی اور غیر محسوس تاثیر پیدا ہوتی ہے، خدا تعالی کی طرف سے خاص عنایت شامل حال ہوتی ہے۔

فصاحت وبلاغت:

انسانی کلام میں بہترین صفت فصاحت وبلاغت ہے۔ فصاحت کا مطلب یہ ہے کہ بات صاف اور واضح ہو، لفظی اور لغوی غلطی نہ ہو، جملے کی بُنت اور الفاظ کی ترکیب درست ہو، غیر مانوس کلمات کا استعمال نہ کیا جائے۔ بلاغت کا مطلب یہ ہے کہ بر محل اور بر موقع بات کی جائے، جو بات جس انداز میں کرنے کی ہو موقع محل، مخاطب کو مد نظر رکھتے ہوئے اسی انداز میں وہ بات کی جائے۔[21]

بہت سے لوگ فصیح ہوتے ہیں یعنی بہت اچھی گفتگو کرتے ہیں، لیکن بلیغ نہیں ہوتے یعنی بے موقع بات کر جاتے ہیں، یا بلیغ تو ہوتے ہیں لیکن فصیح نہیں ہوتے یعنی بات میں چاشنی، سلاست وروانی نہیں ہوتی، نبی کریم ﷺ کو اللہ جل شانہ نے دیگر بے شمار خوبیوں کے ساتھ فصاحت وبلاغت کی صفت سے بھی خوب نوازا تھا، آپ علیہ السلام کا تمام کلام چاہے وہ روز مرہ زندگی کی گفتگو ہو یا دعوت واصلاح کی مجالس کی بات چیت فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں، ہم اختصار کے ساتھ تین مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

ایک دفعہ مدینہ منورہ میں سورج گرہن ہوا، اتفاق سے اسی دن آپ علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تھا، عرب میں یہ خیال تھا کہ کسی عظیم ہستی کی وفات پر سورج اور چاند گرہن ہوتا ہے، تو بہت سے لوگ یہ بات کہنے لگے۔ یہ خیال اسلامی عقیدے کی رو سے درست نہیں، اس لیے نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مسجد میں جمع فرمایا اور خطبہ ارشاد فرمایا، اس خطبے میں آپ نے بتایا کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں اور انہیں گرہن لگنا کسی عظیم شخص کی زندگی یا موت کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ جل شانہ کے حکم کی بنا پر ہوتا ہے۔[22]

اس کی ایک اور مثال فتح مکہ کا موقع ہے، اس موقع پر جب پورا مکہ اندیشوں میں گھرا ہوا تھا، سبھی کو خدشہ تھا کہ آج ہمارے برے رویے کی سزا ملے گی، اس خدشے کے پیش نظر اندیشہ تھا کہ کچھ ایسے لوگ جو ایمان لا کر اسلام کے لیے شاندار خدمات سرانجام دے سکتے ہیں کہیں ملک چھوڑ کر ہی نہ چلے جائیں، جیسے کہ ابو جہل کے صاحبزادے حضرت عکرمہ اور بعض دیگر حضرات شہر چھوڑ گئے، چنانچہ آپ علیہ السلام نے صورت حال بھانپ کر مقتضائے حال کے مطابق خطاب فرمایا اور سب کو تسلی دی کہ اسلام امن وسلامتی کا دین ہے، مکہ امن والا شہر ہے، نبی رحمت للعالمین ہیں اس لیے کسی کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔[23]

اس کی ایک اہم مثال خطبہ حجۃ الوداع ہے۔ اس عظیم موقع پر جہاں آپؐ نے تکمیل دین کا اعلان فرمایا وہیں انسانیت کو ان زریں انسانی حقوق سے نوازا جو عہد حاضر میں ناپید ہوتے جارہے ہیں، نیز اس موقع پر بہت بڑا مجمع تھا۔[24]

اور ان میں اکثر عرب تھے، لیکن آپ علیہ السلام جانتے تھے کہ قدرت خداوندی سے عنقریب مسلمان عجمی ممالک کو فتح کریں گے تو کہیں بعد میں آنے والے عرب عجمی مسلمانوں پر اپنے عربی ہونے کا فخر نہ جتانا شروع کردیں چنانچہ آپ نے چند لفظوں میں ایک جامع کلیہ بیان فرمادیا، آپ نے فرمایا: ''لوگو! کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی کالے کو کسی سرخ پر اور کسی سرخ کو کسی کالے پر کوئی فضیلت و امتیاز حاصل نہیں، فضیلت کا معیار صرف اور صرف تقوی ہے۔''[25]

مختصر خطاب کرنا:

آپ صلی اللہ علیہ طویل خطبہ پسند نہیں فرماتے تھے اور اکثر آپ کے خطبات نہایت مختصر ہوتے تھے، بلکہ کتب حدیث و سیرت میں کئی خطبات ایسے منقول ہیں جو گنے چنے کلمات پر مشتمل ہیں، جاحظ لکھتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دس کلمات پر مشتمل خطبہ بھی دیا ہے۔[26]

نیز صحابہ کرام کو بھی آپ علیہ السلام نے یہی تعلیم فرمائی تھی کہ مختصر خطبہ دیا کریں، چنانچہ ایک بار حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کسی موقع پر خطبہ دینے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے مختصر سا خطبہ دیا، سامعین نے کہا کہ کچھ مزید ارشاد فرمائیے، آپ نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مختصر خطبہ دینے کی ہدایت کی تھی۔[27]

مختصر خطبہ دینے کی ایک وجہ بعض روایات میں یہ ذکر کی گئی ہے کہ طویل خطبات سے سامعین اکتا جاتے ہیں اور ان کی توجہ بٹ جاتی ہے جس وجہ سے خطاب کا فائدہ نہیں ہوتا، اس لیے مختصر بات کرنی چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ طویل خطبہ دینے سے احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ بہت سے سامعین طویل خطبوں کی وجہ سے ضروری بات سننے سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

جوامع الکلم:

اللہ جل شانہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ کو بہت سی خصوصیات اور یکتا صفات سے نوازا تھا، ان صفات میں سے ایک اہم صفت آپ علیہ السلام کو جوامع الکلم کا عطا فرمانا بھی تھا، چنانچہ آپ کے ہر کلام میں یہ صفت واضح نظر آتی ہے اور خطبات میں بطور خاص اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جوامع الکلم کی صفت عطا ہوئی ہے۔[28]

مذکورہ بالا تین صفات (یعنی کلام میں فصاحت وبلاغت ہونا، مختصر خطاب کرنا اور جامع بات کرنا) جس خطاب میں پائی جائیں وہ خطاب سننا آسان ہوتا ہے، طبیعت میں انقباض اور بوجھل پن پیدا نہیں کرتا، اس طرح کی بات یاد رکھنے میں آسانی رہتی ہے اور جب بات یاد رہے تو عمل بھی آسان ہوتا ہے اور دوسروں تک بات پہنچانا بھی آسان ہوتا ہے۔

خطاب میں سوالیہ انداز اختیار کرنا:

خطاب کا عمومی انداز یہ ہوتا ہے کہ خطیب تسلسل سے اپنی بات کرتا چلا جاتا ہے، لیکن دیکھا گیا ہے کہ اگر خطبے کے دوران سامعین سے کوئی سوال پوچھ لیا جائے تو اس سے سامعین خوب متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس طرح کہی ہوئی بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار یہ مؤثر انداز اختیار فرمایا، ان میں سے ایک اہم موقع حجۃ الوداع کا خطبہ بھی تھا، چونکہ یہ خطبہ آپ علیہ السلام کے عمومی خطبات کی بنسبت کچھ طویل ہو گیا تھا تو آپ علیہ السلام نے اس موقع پر سوالیہ انداز اختیار فرمایا تاکہ سامعین کی توجہ خطاب پر مرکوز رہے اور کہی ہوئی خوب اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔

اس خطبے کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ نے متعدد چیزوں کے بارے میں سوال کیا، سب سے پہلے آپ نے سوال کیا:

یہ کون سا مہینہ ہے؟ صحابہ کرام نے یہ سوچ کر کہ ممکن ہے آپ علیہ السلام اسے کوئی نیا نام دیں خاموش رہے، ان کی خاموشی دیکھ کے آپ نے پھر سوالیہ انداز میں فرمایا کہ کیا یہ ذوالحجہ نہیں؟ اسی طرح آپ نے شہر حرم اور دن کے بارے میں بھی سوالات کیے، سب سوالات کے جواب میں صحابہ کرام یہ سوچ کے خاموش رہے کہ ممکن ہے آپ علیہ السلام کوئی نیا نام تجویز فرمائیں، لیکن آپ نے وہی پرانے نام ہی دہرائے، یعنی اس سوال وجواب سے مراد صرف سامعین کو متوجہ کرنا تھا تاکہ آگے کہی جانے والی بات کی طرف ان کی مکمل توجہ رہے۔[29]

اس سے پتا چلتا ہے کہ سامع کو سمجھانے کے لئے ہمیشہ عمومی انداز کا وعظ کافی نہیں ہوتا، بلکہ بسا اوقات بعض خاص طریقے بھی استعمال کرنے پڑتے ہیں، جن میں سے ایک سوالیہ انداز بھی ہے، سوال سامعین کو غور و فکر اور تدبر کرنے کی دعوت دیتا ہے، انہیں معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کا راستہ دکھاتا ہے، چنانچہ معروضی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے سوالیہ انداز خطاب کو بھی اختیار فرمایا ہے۔

مختلف طرح خطاب میں تاثیر پیدا کرنا:

خطاب کی اہمیت کے ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ خطیب کا اصل مقصد صرف سامعین تک بات پہنچا دینا نہیں ہوتا، بلکہ انہیں عمل پر آمادہ کرنا بھی خطیب کے مقاصد میں شامل ہوتا ہے، سامعین کو عمل پر آمادہ کرنے کے لیے ایک اہم عنصر خطاب کو مؤثر بنانا بھی ہے، جب خطاب مؤثر ہو گا تو جس مقصد اور ارادے سے خطاب کیا جا رہا ہے وہ بہتر انداز میں حاصل ہو سکے گا۔

خطاب میں تاثیر مختلف طرح پیدا ہوتی ہے، مثلا: خطاب میں دردمندانہ انداز اختیار کرنا، سامعین کے دلی جذبات کو متحرک کرنا، اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں خطاب کو مؤثر اور سامعین کے لیے مفید بنانے کی دعا کرنا۔ یہ سب نکات ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ کے خطبات میں نظر آتے ہیں۔

اسی طرح ایک طریقہ اہم بات کو معمول کی نسبت بلند آواز سے کہنا یا دو تین بار دہرا کے کہنا بھی ہے، اس سے بھی خطاب میں خاص تاثیر پیدا ہوتی ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ اہم باتوں کو زیادہ بلند آواز سے ارشاد فرماتے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب خطاب فرماتے تو بسا اوقات آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور آپ کی کیفیت ایسی محسوس ہوتی کہ گویا آپ غصے میں ہوں۔[30]

اسی طرح اہم باتوں کو مکرر ارشاد فرمانے کا ذکر بھی متعدد روایات میں آتا ہے۔ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اہم باتوں کو دو یا تین بار دہرا دیا کرتے تھے تاکہ سننے والوں کو بات خوب سمجھ آجائے۔[31]

اس سے پتا چلتا ہے کہ خطاب کو مؤثر بنانے کے لیے مختلف انداز اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ آج کل خطاب کو مؤثر بنانے کے لیے ملٹی میڈیا پروجیکٹر کا استعمال کرنا، مناسب ساؤنڈ سسٹم کا انتظام کرنا بھی اس میں شامل کیا جا سکتا ہے، البتہ اس میں بلا وجہ تکلف، تصنع اور بناوٹ نہیں ہونی چاہیے ورنہ بات میں وہ تاثیر نہیں رہتی جو بے تکلف و تصنع کہی ہوئی بات میں ہوتی ہے۔

یہ دو نکات بھی نہایت اہمیت کے حامل ہیں، خطاب کرنے والا اگر ان پر عمل کرے تو حاضرین کی توجہ خطاب پر رہتی ہے اور توجہ بٹتی نہیں ہے، وہ ہمہ تن گوش ہو کر بات سنتے ہیں، جس سے خطاب کے مقاصد حاصل ہونے میں خصوصی معاونت ملتی ہے۔ لقمہ لے لیتے تھے:

آپ صلی اللہ علیہ کا معمول تھا کہ جب خطبہ ارشاد فرماتے اور خطبے کے دوران کوئی صاحب کسی نکتہ کی طرف توجہ دلاتے تو آپ برا ماننے کی بجائے اس بات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور خطبے میں اس کا تذکرہ بھی فرماتے۔ آپ علیہ السلام کی اس مبارت عادت کا متعدد مواقع پر ظہور ہوا، جس کی ایک مثال فتح مکہ کے موقع پر دیا جانے والا خطبہ ہے، جب آپ علیہ السلام نے مکہ کی عظمت و حرمت بیان کرتے ہوئے حدود حرم میں شکار کرنے، درخت اور گھاس پھونس کاٹنے سے منع فرمایا، اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مکہ میں گھاس کی ایک خاص قسم ہے جسے اذخر کہتے ہیں، یہ گھاس مکہ کے باشندوں کی روز مرہ ضرورت کی چیز ہے اسے کاٹنے سے ممانعت کی گئی تو اہل مکہ کو دشواری ہو گی، اس لیے اسے کاٹنے کی اجازت مرحمت فرمادي جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاص گھاس کو عمومی حکم سے مستثنی فرمادیا۔[32]

اس سے پتا چلتا ہے کہ دوران خطبہ اگر حاضرین میں سے کوئی صاحب کسی خاص پوائنٹ کی طرف توجہ دلائیں تو خطبہ کہنے والوں کو ناگواری محسوس کرنے کی بجائے اس پوائنٹ کا ذکر اپنی گفتگو میں کر لینا چاہیے۔

بوقت ضرورت خطبہ روک دیتے تھے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ خطبہ ارشاد فرمارہے ہوتے اور مجلس میں کوئی ایسی بات پیش آجاتی جس کی وجہ سے حاضرین کی توجہ بٹنے کا اندیشہ ہوتا، یا کوئی صاحب کوئی بات کہنا چاہتے تو آپ خطبہ روک کے اس صورت حال کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے، اس کی بھی متعدد مثالیں کتب حدیث و سیرت میں ملتی ہیں، چنانچہ ایک دفعہ دوران خطبہ حضرت حسن یا حسین میں سے کوئی ایک مسجد میں تشریف لے آئے، آپ رضی اللہ عنہ گرتے پڑتے چلے آرہے تھے، آپ علیہ السلام نے دیکھا تو آپ خطبہ روک کر منبر سے اترے اور انھیں گود میں اٹھایا اور پھر دوبارہ خطبہ شروع کیا۔[33]

اسی طرح ایک دفعہ آپ علیہ السلام خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ بعض صحابہ کرام نے دوران خطبہ آپ علیہ السلام سے بارش کے لیے دعا کرنے کی درخواست کی، آپ علیہ السلام نے ان کی درخواست پر خطبے کے دوران بارش کی دعا فرمائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران خطبہ اگر کوئی ایسی سرگرمی ہونے لگے تو ضرورت کی وجہ سے خطبہ روکا جاسکتا ہے۔

ممانعت میں تدریجی انداز اختیار کرنا:

انسانی طبیعت ہے کہ بعض چیزوں کو یک دم چھوڑنا اس پر شاق گزرتا ہے، مشکل ہوتی ہے، چنانچہ اللہ جل شانہ نے اکثر احکام میں تدریجی انداز اختیار فرمایا ہے، یعنی درجہ بدرجہ چیزوں کی ممانعت فرمائی ہے، مثلاً: شراب کی حرمت کے بارے میں ابتداءً یہ فرمایا گیا کہ اس میں فوائد اور نقصانات دونوں ہیں، البتہ نقصان زیادہ ہیں۔[34]

یہ سن کے بہت سے صحابہ کرام اس سے رک گئے۔ اس کے بعد یہ حکم نازل ہوا کہ شراب کے زیر اثر ہونے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔[35]

اس آیت کے نزول کے بعد مزید بہت سے صحابہ کرام نے شراب نوشی ترک کر دی، لیکن عادی لوگ اب بھی نہ رک سکے، البتہ ان کے دلوں میں بھی قباحت کا خیال بیٹھ چکا تھا اور انہیں اندازہ تھا کہ عنقریب مکمل حرمت نازل ہو جائے گی، گویا ذہنی طور پر وہ تیار ہو چکے تھے، چنانچہ جب مکمل حرمت نازل ہوئی تو سب کے لیے اس پر عمل کرنا آسان ہو گیا۔

یہ تین نکات (یعنی حاضرین کی طرف سے کہی گئی بات خطاب میں شامل کر لینا، بوقت ضرورت خطاب میں وقفہ کرنا اور خطاب میں تدریج کی رعایت رکھنا) خاص نفسیاتی اثر رکھتے ہیں، ان پر عمل کرنے سے سامعین کی خاطر داری ہوتی ہے جس سے بات کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔[36]

نتائج بحث اور سفارشات:

اس تمام بحث سے مندرجہ ذیل نکات حاصل ہوتے ہیں:

- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اعمال اور سنن امت کے لیے اسوہ حسنہ ہیں، ان اعمال میں آپ علیہ السلام کے خطبات بھی شامل ہیں۔ آپ علیہ السلام کے خطبات خاص اہمیت کے حامل ہیں، ان میں امت کے لیے بہت سے راہنما اصول موجود ہیں، ہمیں ان سب اصولوں پر حتی الامکان عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔
- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات میں غیر معمولی تاثیر ہوتی تھی، دیگر وجوہات واسباب کے ساتھ اس غیر معمولی تاثیر کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ آپ علیہ السلام کا خطاب سادہ ہوتا تھا، اس میں تصنع کا ذرہ شائبہ نہیں ہوتا تھا، آپ کا خطاب مخاطبین کی غم خواری کا مظہر ہوتا تھا، نیز آپ علیہ السلام اصلاح کی غرض سے جب کسی فعل پر نکیر فرماتے تو عمومی انداز اختیار فرماتے تھے، کسی خاص شخص کو ہدف نہیں بناتے تھے، اس کے علاوہ آپ امت کے لیے دعاؤں کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔
- آپ علیہ السلام کا خطاب سامعین کے لیے بوجھل نہیں ہوتا تھا، بلکہ سامعین انبساط اور دلچسپی کے ساتھ آپ کا خطاب سنتے تھے، جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آپ کا خطاب فصیح و بلیغ ہوتا تھا، آپ مختصر خطاب فرمایا کرتے تھے اور جامع بات ارشاد فرماتے تھے۔
- آپ علیہ السلام جب خطاب فرماتے تو سامعین مکمل توجہ سے سنتے تھے، کیونکہ آپ علیہ السلام کے خطاب میں مختلف طرح سے تاثیر شامل ہوتی تھی، آپ حاضرین سے کبھی سوال بھی کر لیتے تھے، بات کی اہمیت کے مطابق آواز میں اتار چڑھاؤ بھی ہوتا تھا، ضروری بات کو دہرا کر بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

- آپ علیہ السلام کے خطاب میں سامعین کی نفسیات کا بھی بطور خاص خیال رکھا جاتا تھا، آپ سامعین کی نفسیات کے مطابق خطاب فرمایا کرتے تھے، انداز بھی ایسا اختیار فرماتے اور سامعین کا مکمل خیال رکھتے تھے، مثلاً سامعین کی طرف سے کوئی بات کہی جاتی تو آپ اس کا بطور خاص تذکرہ فرماتے، ضرورت پیش آتی تو خطاب میں وقفہ بھی فرماتے، جب کسی بات سے منع کرنا مقصود ہوتا تو انسانی طبیعت کے مطابق تدریج کا انداز اختیار فرماتے تھے۔
- ان نکات کی رعایت رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خطاب کا مقصد بہتر انداز میں حاصل ہوتا ہے، یعنی سامعین اور مخاطبین دوران خطاب توجہ اور انہماک سے بات سنتے ہیں اور کہی ہوئی بات پر خود بھی عمل کرتے ہیں، دوسروں تک بھی بات پہنچاتے ہیں اور بات کہنے والے کے ساتھ انہیں قلبی لگاؤ بھی پیدا ہو جاتا ہے جو مزید دینی ترقی کا سبب بنتا ہے۔

اگر ہم بھی اپنے خطاب میں تاثیر پیدا کرنا چاہتے ہیں اور کہی ہوئی باتوں کو ثمر بار دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں نہ صرف اپنی خطابات میں، بلکہ روز مرہ زندگی میں بھی ان سنہری نکات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنا چاہیے، اس سے نہ صرف ہمارے دنیوی معاملات بہتر ہوں گے، بلکہ سنت پر عمل کرنے کی وجہ سے اخروی فلاح بھی حاصل ہو گی۔

حوالہ جات وحواشی

1 الاحزاب:21، تقی عثمانی، **آسان ترجمہ قرآن**، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، 2011، ج:3، ص:1289

Al ahzāb: 21, Taqī usmānī, **Āsān tarjmah Qurān**,Maktab e Mārif ul Quran, Karachi, Vol: 3, page: 1289

2 معلوف، لویس، **المنجد، ترجمہ: بلیاوی**، ابوالفضل، عبدالحفیظ، لاہور، افضل شریف پرنٹرز، ص:208

Mālōf, lu'aīs, **Al Munjid, Tarjmah: Balyāvī**, Abū Al fazal, Abdul hafēz, Lahōre: Afzal sharēf printers, page: 208

3 الاصفہانی، راغب، حسین بن محمد، **المفردات فی غریب القرآن**، کارخانہ تجارت کتب، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص:150

Al Asfahānī, Rāghib, Husa'in bin Muhammad, **Almufradāt fī gharēb Al Qurān**, Kārkhānah Tijārat Kutub, Karachi, 1961, page: 150

4 ابن منظور، لسان العرب، دار المعارف، قاہرہ، ص:۱۱۹۴

Ibn e Manzōr, **Lisān Al a'rab**, Dār ul Ma'ārif, Qāhīrāh, Page: 1194

5 جرجانی، علی بن محمد، میر سید شریف، **التعریفات**، دار الکتب العلمیہ، لبنان، طبعہ اولی، 1983، ص:99

Jurjānī, Alī bin Muhammad, Mēr Saīyyid Sharif, **Al ta'rifāt**, Dār ul Kutub Al ilmiyah, Labnān, 1983, Page: 99

6 احمد نگری، عبد النبی بن عبد الرسول، **دستور العلماء**، مترجم: حسن ہانی فحص، دار الکتب العلمیہ، لبنان، بیروت، طبعہ اولی، ج:2، ص:60

Ahmad Nagrī, Abd Al Nabī bin Abd ur Rasūl, **Dastōr Al Ulmā**, Dār ul Kutub Al Ilmiyah, Labnān, Berūt, Vol:2, Page: 60

7 مودودی، ابوالاعلیٰ، **تفہیم القرآن**، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۵۲ء، ج:1، ص:25

Mawdūdī, Abū al Aālā, **Tafhīm ul Qurān**, Maktabah Tamīre Insaniyat, Lahore Vol: 1, Page: 25

8 اصلاحی، امین احسن، **دعوت دین اور اس کا طریقہ کار**، مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، لاہور، جولائی، ۱۹۵۱ء، ص:96

Islāhī, Amīn Ahsan, **Da'wat Dīn aūr Us kā Tarīqāh Kār,** Markazī Maktabah Jamāa't Islāmī Lahore, 1951, Page: 96

9 بخاری، محمد بن اسماعیل، **الصحیح**، دار طوق النجاۃ، مدینہ منورہ، ج:7، ص:19، حدیث:5146

Bukhārī, Muḥammad bin Isma'īl, **Al Ṣaḥīḥ,** Dār Tawq al-Najat, Madina Munawara, Vol: 7, Hadīth: 5146, Page: 19

10 ڈیوڈ ہیوم، **فہم انسانی**، مترجم، عبد الباری، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:143

David Hume, **Feham e Insani,** Translator, Abdul Bari, Book Home, Lahore, 2005, Page No. 143

11 اس کی متعدد مثالیں کتب حدیث میں ملتی ہیں، ایک مثال ملاحظہ ہو: مسند احمد بن حنبل، موسسۃ الرسالہ، ج: 27، ص: 106، حدیث:16572

12 قرآن مجید میں تین بار عرب کے زبان دانوں کو چیلنج کیا گیا، پہلی بار سورہ بنی اسرائیل آیت 88 میں مکمل قرآن کا مثل لانے کا چیلنج دیا گیا، جب وہ نہ کر سکے تو سورہ ہود آیت 13 میں دس سورتیں لانے کا مطالبہ ہوا، جب یہ بھی نہ کر سکے تو کم ترین درجے میں سورہ بقرہ آیت 23 میں ایک آیت لانے تک کی چھوٹ دی گئی لیکن یہ بھی ان سے نہ ہو سکا اور بھلا ہو بھی کیسے سکتا تھا، آخر مخلوق کے کلام کو خالق کے کلام سے نسبت ہی کیا ہے۔

13 بخاری، الصحیح، ج:4، ص:180، حدیث:3506

Bukhari, **Al-Sahih**, Vol: 04, Page No. 180, Hadith No. 3506

14 Philip K. Hitti, **History of Arabs**, Macmillan Education Ltd, London, 1989, p.g.no. 249

15 محمد ادریس، **خطبات نبویؐ**، ادبستان لاہور، ۱۹۸۲، ص ۱۱-۱۲

Muhammad Idrīs, **Khutbāt Nabvī**, Adab Bis Tān, Lahore, 1982, Page: 11-12

16 ابن حنبل، الامام احمد بن حنبل، **مسند**، موسسۃ الرسالہ، طبعہ اولی، 1995، ج:4، ص:329، حدیث:2544

Ibne Hanbal, Al Imam Ahmad Bin Hanbal, **Musnad**, Muassah Al Risālah, 1995, Vol: 4, Page: 329, Hadīth: 2544

17 الشعراء:214، تقی عثمانی، **آسان ترجمہ قرآن**، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، 2011، ج:2، ص:1140

Al shuarā: 214, Taqī Usmānī, Āsān Tarjmah Qurān, Maktabah Marif Al-Quran, Karachi, vol: 2, Page: 1140

18 ابن کثیر، **البدایۃ والنہایۃ**، تحقیق عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی، مطبعہ ہجر، طبعہ اولی، مصر، 1997، ج:4، ص:101
Ibne Kasīr, **Albidāyah Wanihāyah**, Jizah, Matbaa'h Hijr, Egypt, 1997, Vol: 4 Page: 101

19 یہ انداز خطاب متعدد احادیث میں منقول ہے، ملاحظہ کیجیے: مسند احمد، مؤسسۃ الرسالۃ، ج: 18، ص: 136، حدیث: 11591۔ نیز: ج:19، ص:121، حدیث:12065۔ اسی طرح: سنن ابوداود (دارالفکر) ج:1، ص:303، حدیث:913

20 احمد، مسند احمد، **مؤسسۃ الرسالۃ**، ج:26، ص:137، حدیث:16207
Ahmed, **Musnad**, Muassah Al Risālah, Vol: 26, Page No. 137, Hadith: 16207

21 الجارم، علی، امین، مصطفی، **البلاغۃ الواضحۃ**، دار المعارف، لندن ص:5-8
Al Jārim, A'lī, Amīn, Mustafā, **Al Balāghah Al Wazihah,** Dar Al Ma'ārif, London, Page: 5-8

22 بخاری، **الصحیح**، ج:1، ص:34، حدیث:1043
Bukhārī, **Al Ṣaḥīḥ**, Vol: 1, Page: 34, Hadīth: 1043

23 شبلی نعمانی، **سیرت النبی**، ادارہ اسلامیات، اشاعت اول، 2002، لاہور، پاکستان، ج:1، ص:313-316
Shiblī Numānī, Sīrat Al Nabī, Idārah Islāmiyāt, Lahore, Vol: 1, Page: 313-316

24 حجۃ الوداع میں شرکائے حج کی تعداد کے متعلق اکثر حضرات کا قول ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کا مجمع تھا، بعض حضرات نے ایک لاکھ چوالیس ہزار کی تعداد بھی لکھی ہے، ملاحظہ ہو: صفی الرحمن مبارک پوری، الرحیق المختوم، وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیہ، قطر، 2007، ص:459

25 ڈاکٹر حمید اللہ، **رسول اللہ کی سیاسی زندگی**، نگارشات، لاہور، 2013، ص:295
Dr. Hamīd Ullah, **Rasūl Lullah Kī Siyāsī Zindagī**, Nigarshāt, Lāhore, 2013, Page: 295

26 جاحظ، ابو عثمان عمرو، **البیان والتبیین**، کتبہ الخانجی، طبع سوم، 1998، قاہرہ، ج:1، ص:302
Jahiz, Abū Ū'smān A'mar, **Albiyān Wl Tabyīn,** (Qāhīrāh: Maktabah Al Khānjī, Taba' Sūm 1998) Volume: 1, Page: 302

27 ایضا، ص:303
Ibid, Page No. 303

28 مسند احمد، **مؤسسۃ الرسالۃ**، ج:12، ص:366، حدیث:7403
Masnad Ahmad, **Muassist-Ur-Risālah**, Vol: 12, Page: 366, Hadīth: 7403

29 ابن ہشام، عبدالملک، **السیرۃ النبویۃ**، دار الکتاب العربی طبعہ ثالثہ، بیروت، لبنان، 1990، ج:4، ص:250
Ibne Hashām, Abdul Malik, **As Sīratun Nabviyah**, Dar Al Kutub Ala'rabī, Berūt Labnān, 1990, Vol: 4, Page: 250

30 مسلم، ابن الحجاج، **الصحیح**، بیت الافکار الدولیۃ، ریاض، 1998، ص:335، حدیث:867
Muslim Ibn Al Hajāj, **Al-Sahih,** Baitul Afkār Al Dualiyah, Riyādh, 1998, Page: 335, Hadīth: 867

31 ترمذی، ابو عیسی، محمد بن عیسی، **جامع ترمذی**، مصطفی البابی، طبعہ دوم، جیزہ، مصر، 1975، ج:5، ص:600، حدیث:3640
Tirmizī, Muḥammad Ibne Ēisā, **Jamiyah Tirmizi,** Jezah, Matbā Mustafā Al Bābī, Al Halabī 1975, Vol: 5, Page: 600, Hadīth: 3640

32 مسند احمد، **موسسۃ الرسالۃ**، ج:4، ص:184، حدیث:2353

Masnad Ahmad, **Muassist-Ur-Risālah**, Vol: 04, Page: 184, Hadīth: 2353

33 ترمذی، **سنن ترمذی**، ج:5، ص:658، حدیث:3774

Tirmizi, **Sunan Tirmizī**, Vol: 5, Page: 650, Hadīth: 3774

34 لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں گناہ بھی ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھا ہوا ہے۔ البقرہ:219، تقی عثمانی، آسان ترجمہ قرآن، ج:1، ص:137

35 اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو اس وقت نماز کے قریب بھی نہ جانا۔ النساء:43، تقی عثمانی، آسان ترجمہ قرآن، ج:1، ص:267

36 نفسیاتِ سیرت ایک باقاعدہ اور بہت عمدہ موضوع ہے، اس موضوع پر کام کی خاص ضرورت ہے جس سے سیرت کے کئی مفید گوشے سامنے آسکتے ہیں، ڈاکٹر محمود احمد غازی نے محاضرات سیرت میں اس حوالے سے مختصر لیکن مفید گفتگو فرمائی ہے، تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: محاضرات سیرت، ص:98 اور مابعد، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، اشاعت سوم، 2009